© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

اساسیاتِ اسلام

(۶)

وجودیت کو فلسفہ حیات کہنا صحیح نہیں - یہ دراصل حد سے بڑھی ہوئی عقلیت (RATIONALISM) اور ان تصورات کے خلاف ایک ردِ عمل کا نام ہے کہ جو انسان کی زندگی میں موزوں مقام عطا نہیں کر سکے. کیر کے گارڈ (KIERKEGAARD) جیسپرس (JASERS) اور سارترے (SARTRE) اس اندازِ فکر کے بڑے بڑے نقیب ہیں. یہ انسان کے بارہ میں اس تفریق کے قائل نہیں کہ یہ جوہر و عرض سے ترتیب پذیر ہے - ان کے نقطہ نظر سے انسان ایک وجود ہے جو جذبات، خواہشات اور محرومیوں سے دوچار ہوتا ہے اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کی پریشانیوں اور باطنی و دخلی اضطرابات کو کیونکر رفع کیا جا سکتا ہے - اس اشکال کو حل کرنے کے لیے انھوں نے دو بنیادی حقیقتوں کی نشان دہی کی ہے - ایک زندگی کا اہمال یا موت اور قطعی عدم کا تصور اور دوسرے آزاد ارادہ - زندگی کے بارہ میں یہ لوگ اس لیے زیادہ سوچنے کے عادی نہیں کہ یہ ایک وقفہ ہے نہایت ہی مختصر جس کا محل وقوع عدم سابق اور عدم لاحق کے مابین ہے - یوں سمجھ لو کہ ان کے نزدیک زندگی اصل شئ نہیں - اصل شئ عدم محض موت اور فنا ہے - اور یہ حیات آساشئ جسے ہم زندگی کے آرزو پرور لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، صرف فریبِ زندگی ہے - جسے بہرحال ختم ہونا ہے - زندگی کے بارہ میں یہ تجزیہ اگر درست ہے تو پھر اتنا مختصر سا وقفہ زندگی واقعی کسی بھاری بھرکم نظامِ حیات یا فلسفہ کا متحمل نہیں ہو سکتا - اس کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ بوقتِ ضرورت ہر ہر شخص اپنی صوابدید یا ارادہ کے مطابق یہ فیصلہ کرے کہ اسے کیا قدم اٹھانا ہے اور کس طرح مشکلات سے عہدہ برآ ہونا ہے - کن چیزوں کو پسند کرنا ہے اور کن چیزوں کو پائے استحقار سے ٹھکرانا ہے -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہماری رائے میں یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں۔ زندگی بجائے خود رحمت و نعمت ہے یا اہمال اس کا اندازہ موت کے پیمانے سے نہیں لگایا جا سکتا۔ زندگی کو خود زندگی کے آئینہ میں دیکھیے۔ اس کے بہاد آفرین تقاضوں کی شکل میں ملاحظہ کیجیے اور اس کو علمی، فنی اور تہذیبی فتوحات اور کامرانیوں کی صورت میں مشاہدہ کیجیے اور پھر یہ بتائیے کہ کیا یہ اللہ کا بہت بڑا انعام نہیں؟ مایوسی، قنوط اور افسردگی فلسفۂ حیات نہیں محض مزاج سے تعلق رکھنے والی شئے ہے۔ اگر فکر و نظر میں حسن ہے، قلب و نظر میں سرشاری اور انبساط ہے تو پھر نہ صرف یہ رزم گاہِ حیات دامانِ گل فروش ہے بلکہ غم اور اندوہ میں بھی نکھار اور لذت پائی جاتی ہے۔ سقراط نے آخر یونہی تو زہر نہیں پی لیا تھا جو نے بغیر سوچے سمجھے تو نقدِ جاں سے محرومی اختیار نہیں کی تھی اور عاشقِ رسول حضرت خبیب نے بغیر کسی احساسِ لطف کے تو یہ نہیں فرمایا تھا:

ولست ابالی حین اقتل مسلماً　　علی ای شقٍ کان للہ مصرعی

وجودی فلسفہ کے حامی زندگی کو وقت کے طول و عرض سے ناپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ زندگی کمیت کا نام نہیں، کیفیت کا نام ہے۔ چنانچہ اہلِ حق کے نزدیک فکر و تعمق کا ایک لمحہ عرفان و علم اک کا ایک ثانیہ اور نصب العین کو پا لینے کی تمنا و آرزو کا ایک پل ایسا خوش آیند اور قیمتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں حیاتِ جاوداں کا طویل ترین عرصہ سراسر بے معنی ہے جس میں فکر و احساس کی جنبشیں نہ پائی جائیں۔

اس فلسفہ میں دوسری عظیم خامی یہ ہے کہ اس میں اقدارِ حیات کو مستقل حیثیت دی گئی ہے اور خواہ مخواہ فرض کر لیا گیا ہے کہ چونکہ انسانی مشکلات کو جوں کا توں رہنا ہے۔ اضطراب اور بے چینی کو بہر حال پھیلنا ہے اور غم و اندوہ کے مہیب سایوں کو ہر صورت میں آزردگی اور افسردگی پیدا کرنا ہے۔ اس لیے ان سے بچنے اور محفوظ رہنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ارادہ یا پسند سے کام لیں اور دیکھیں کہ ہم کس حد تک ان کانٹوں سے اپنا دامن بچا لینے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ارادہ یا پسند سے ان کی کیا مراد ہے؟ سر دست اس پر غور نہ کیجیے۔ غور اس چیز پر کیجیے کہ اقدارِ حیات یا زیست کی یہ ناہمواریاں کیا ہیں؟ اور آیا ان ناہمواریوں پر ہم قابو پا سکتے ہیں، یا پست ہمتی کی اور بات ہے۔ زندگی کے بارہ میں صحت مند نقطۂ نظر یہی ہو سکتا ہے کہ انسان نہ صرف اضداد کے ان فاصلوں کو کم کر سکتا ہے کہ جن کی وجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے فضا میں گھٹن اور افسردگی کا دَور دَورہ ہے۔ بلکہ اس کے ذوقِ جمال سے بجا طور پر یہ توقع بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ زندگی کی زلفِ تابدار کو اور تابدار بنانے کی کوشش کرے گا اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ انسان نے بڑی حد تک اضداد اور ناہمواریوں پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ فکر و نظر کا سب سے بڑا تضاد یہی تھا کہ یہ عالم جس میں رہنے کے لیے ہم مجبور ہیں ہمارا حریف ہے اور کائنات کا یہ عظیم اور بے رحم سلسلہ جس سے ہم دوچار ہیں ہماری زندگی سے نہ صرف یہ کہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، بلکہ اُلٹے ہمارے دَرپئے آزار ہے۔ اس کھلے ہوئے تضاد پر انسان کے اس داعیہ و عزم نے قابو پالیا ہے کہ ہمیں اس دنیا کو زیرِ فرمان رکھنا ہے اس کے رازہائے سربستہ کو دریافت کرنا ہے اور اس کی پہنائیوں اور وسعتوں سے استفادہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تخلیقی کوششوں سے تضادات کا حلقہ تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرا تضاد جسمِ انسانی کے عوارض اور امراض کا تھا، اس کو بھی طبِ جدید کی حیرت انگیز ترقی نے قریب قریب ختم کردیا ہے۔ چنانچہ اب طاعون، ہیضہ، چیچک، ٹائیفائڈ اور دق کو قابلِ علاج سمجھا جاتا ہے۔ ناقابلِ علاج بیماریوں میں اب صرف سرطان اور فالج کی بعض قسمیں باقی رہ گئی ہیں لیکن انسان مایوس نہیں ہوا۔ ان پر ریسرچ کے بارہ میں لاکھوں روپے صرف ہو رہے ہیں۔

تیسرا تضاد وہ ہے جو فرد و معاشرہ میں تعلقاتِ باہمی کی عدم تعیین ہے اور یہ بہت اہم ہے۔ نوعِ انسانی کی بہت سی تکلیفیں محض اس بنا پر پیدا ہوتی ہیں کہ ہم انسانی تعلقات کو ابھی تک ایسے صحیح تر اور موزوں عمرانی، تمدنی اور تہذیبی سانچوں میں نہیں ڈھال پائے ہیں جو امن و خوش حالی کے ضامن ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم و روشنی کے اس دَور میں بھی ہماری صفوں میں رنگ و نسل کا تعصب پایا جاتا ہے، خواجہ و بندہ کا امتیاز موجود ہے اور غریب اور امیر میں عناد و دشمنی کی دیواریں حائل ہیں، جو بلند سے بلند تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ معاشرہ کے اس تضاد کے متعلق بھی ہم وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ناقابلِ علاج نہیں۔ علمی، سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی سطح پر اصلاحِ احوال کی کوششیں برابر جاری ہیں جو کامیاب ہو کر رہیں گی۔ انسان تعصبات اور غلط فہمیوں کا وقتی طور پر شکار ہو سکتا ہے۔ مگر اتنا احمق نہیں ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ فلاح و بہبود کے تقاضوں کو ہمیشہ نظر انداز کرتا رہے۔ آخر ایک دن جہالت و تعصب کے اندھیروں کو چھٹنا اور آفتابِ حقیقت کو ضیا افروز ہونا ہے۔ موت البتہ ایک ایسا تضاد ہے جو زندہ رہے گا۔ لیکن اس کو بھی اہمال (Absurdity) سے کیوں تعبیر کیجیے کیوں نہ ناگزیر حقیقت کہیے۔ اس حادثہ کے لیے جس سے ہر ہر شخص کو بہر حال دوچار ہونا ہے۔

وجودی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر موت کی قطعیت اور سنگینی کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے زندگی کے نقشہ کو ترتیب دینے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر بلاشبہ صحیح ہے۔ اگر ایک شخص مسرت اور خوشی کے لمحوں میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتا کہ طرب و ابتہاج کی فرصتیں محض عارضی ہیں تو اس کے طرزِ عمل میں اس اندازِ فکر سے ایک طرح کا توازن پیدا ہو جائے گا اور اس کے قلب و ضمیر میں ذمہ داری کا احساس کہیں اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ یہی نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ جمالیاتی اور تخلیقی ذوق کے لیے عمرِ عزیز کا یہ اختصار مہمیز ثابت ہو۔ اور وہ ایسے کارہائے نمایاں انجام دے جائے کہ جو رہتی دنیا تک زندہ و تابندہ بنیں۔ موت کی افادیت کا یہ پہلو کیا کم قابلِ غور ہے؟ موت بظاہر ضرور اچانک اور خلافِ توقع آتی ہے اور اسی بنا پر خوفناک بھی ہے لیکن اسے ہر طرح کی منطق و قاعدہ سے معرا سمجھنا غلط ہے۔ اس کے پیچھے قوانینِ طبعی کا ایک طویل اور پیچیدہ سلسلۂ اسباب کارفرما ہے جس کی تمام کڑیاں چونکہ ہمارے سامنے نہیں ہیں اس بنا پر ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ اچانک اور بے قاعدہ محض کسی کا سہاگ لوٹنے کے لیے آتی ہے یا اس لیے آتی ہے کہ کسی شاداں و فرحاں کنبے سے اس کی عزیز ترین متاع چھین لے اور عمر بھر کے لیے اس کو محتاج و لاچار بنا دے۔ یہ بات نہیں موت زندگی کا جزو ہے اور جزو تکمیلی ہے۔ اس کو افراد کی روشنی میں نہ دیکھیے بحیثیت مجموعی نظامِ حیات کے دیکھیے۔ اس سے اخلاق و عادات اور کردار و سیرت میں ایسے ایسے لطائف پیدا ہوتے ہیں جو حیاتِ جاوداں کی شکل میں پیدا نہیں ہو سکتے۔

مزید برآں اس میں یہ فلسفہ بھی پنہاں ہے کہ یہ زندگی کو زیادہ لذیذ، زیادہ عمیق اور زیادہ بامعنی بنا دیتی ہے۔ موت نہ ہو تو انسان اس طرح سنگدلی اور قساوتِ قلبی کا پیکر بن جائے اور اس طرح حرص و آز اس پر غلبہ پالیں کہ اس کو پہچاننا مشکل ہو جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غرض یہ ہے کہ موت کو قدرت کا اہمال نہ کہیے۔ بلکہ یوں کہیے کہ جس طرح زندگی نظامِ فطرت کا ایک حصّہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح موت بھی اسی نظم و قاعدہ کا ایک ناگزیر جزء ہے۔ سوال دراصل یہ ہے کہ موت جب ایک حقیقت ہے اور ناگزیر حقیقت ہے تو ہمیں اس کے مقابلہ میں زندگی کے بارہ میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس تضاد پر ہم شخصی سطح پر تو قابو پانے سے رہے لیکن یہ چیز تو بہر حال ہمارے اختیار میں ہے کہ اپنے پیچھے اعمالِ خیر کا ایک ایسا زندہ و جاوید سلسلہ چھوڑ جائیں جو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہو۔ اس طرح ہم موت کو بھی گویا شکست دینے میں کامیاب رہیں گے۔

وجودی فلسفہ میں ارادہ یا پسند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ارادہ یا پسند سے ان کی مراد ایک فرد کی وہ جنبشِ فکر نہیں ہے جو کسی بھی پیچیدہ صورتِ حال میں خود بخود عمل کی ایک متعین شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ارادہ یا پسند کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ وہ ایک فرد کا ارادہ یا پسند نہ ہو۔ بلکہ ایسا ہمہ گیر ارادہ یا پسند ہو جس سے پوری انسانیت کی ترجمانی ہوتی ہو۔ جو جمالیاتی معیار کے عین مطابق ہو اور جس کے اختیار کرنے میں ایک شخص پوری طرح آزاد ہو۔ کوئی اذعانیت اس کی راہ نہ روکے، کوئی داخلی و خارجی قدغن یا پابندی اس کے فیصلہ پر اثرانداز نہ ہو۔ اور کوئی عقیدہ یا نظریہ اس کو متاثر نہ کرے۔ ایسا چُھا تُلا اور آزاد ارادہ یا پسند ہی ایسی خیر ہے کہ جس کے ذریعہ ایک فرد زندگی کے کم از کم عرصے میں اطمینان اور مسرت کی زیادہ سے زیادہ مقدار سمیٹ لینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ وجودیت کے فلسفہ میں زبردست خلل یہ ہے کہ اس کی بنیاد دلائل و براہین کے بجائے شعریت (Romanticism) پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قائم کردہ مقدمات ( ) میں پرلے درجے کا ابہام اور تناقض پایا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایک ارادہ یا پسند اپنے مزاج کے اعتبار سے شخصی و انفرادی نہیں ہے اور اس کی صحت و استواری کا پیمانہ خود اس شخص کی آرزوئیں، تمنائیں اور فوائد نہیں ہیں بلکہ چار و ناچار اس کو دوسرے پیمانوں میں ڈھلنا ہے۔ دوسرے معیاروں پر پورا اترنا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ اس کو اپنے ارادہ و پسند کے سلسلہ میں کسی نہ کسی نظام فکر سے بہر حال وابستہ رہنا ہے اور کسی نہ کسی اجتماعی فکر و رائے کی پابندی کرنا ہے۔ اس صورت میں فرد کا اپنا آزاد ارادہ کب رہا۔ عقیدہ اور اجتماعیت کی یہی تو اد گن گھاٹی تھی کہ جس کو یہ لوگ عبور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی بد قسمتی دیکھیے کہ اسی میں گھوم پھر کر گرے اور بُری طرح گرے۔ یوں بھی آزادی ارادہ کی اصطلاح بے معنی ہے۔ کیونکہ ارادہ آن کی آن میں ایک لہر یا موج کی صورت میں ترتیب نہیں پاتا۔ بلکہ یہ ذہن کا ردِ عمل ہے جو تعلیم و تربیت اور تاثر کے کئی مرحلوں سے گذر کر آخر ایسے فیصلہ کن موڑ پر پہنچتا ہے کہ جہاں اس پر ارادہ کا اطلاق ہوتا ہے اور تعلیم و تربیت اور تاثر کے یہ مسئلے بہر حال پیمانوں، عقیدوں اور نظریوں کو لیے ہوتے ہوتے ہیں۔ یہ تجزیہ اگر صحیح ہے تو اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ فرد مجبور ہے کہ اپنے ذہن کو کسی نہ کسی نظام فکر کے ساتھ وابستہ رکھے۔

فرض کیجیے ایک شخص ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے جہاں اجتماعی قوانین اور جمہور کا اخلاق اس کی ذاتی خواہشات اور فوائد کے آڑے آتا ہے اور یہی دراصل وہ پیچیدہ مرحلہ ہے جہاں ارادہ و پسند کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اب اگر وہ اس ماحول کا ساتھ بدرجہ مجبوری دیتا ہے تو اپنی ذات کے ساتھ انصاف روا نہیں رکھتا اور مخالفت کرتا ہے تو معاشرہ اور اس کی اخلاقیات سے غداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فیصلہ کی کوئی بھی نوعیت ہو اس سے لامحالہ ایک طرح کا نفاق پیدا ہوگا۔ جو ذات کی وحدت و سالمیت کو ختم کر دے گا۔

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com